حقیقی پرواز



شہید اسحاق حسین آزانچی

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

حقیقی پرواز

جملہ حقوق بحق مولف محفوظ ہے

کتاب کا نام: (حقیقی پرواز)
مصنف: آمنہ بتول ابراہیم ہادی

فہرستِ مظامین

الفاظ شروعات

اللہ کے پاک نام سے آغاز کرتا ہوں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ وہ ذات جس نے ہمیں پیدا کیا، ایمان کی دولت دی، اور ہمیں اس عظیم دور میں زندہ رکھا جہاں انتظارِ امام مظلومؑ ہی سب سے بڑی سعادت ہے۔ یہ کوئی عام نصیب نہیں بلکہ اللہ کی خاص عطا ہے کہ ہم اُن کے منتظرین میں شمار ہوں۔

انسان اگر ذرا سا بھی اپنی زندگی پر غور کرے تو اسے سمجھ آجائے گا کہ اللہ کی کتنی نعمتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ ہمیں ایسے امام کے دور میں پیدا کیا گیا ہے جن کے آنے پر قیامت کی گھڑیاں رکھی گئی ہیں، جن کے انتظار میں ہر مظلوم دل سے آہیں بھرتا ہے اور اپنی زندگی کے لمحے گن رہا ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی سعادت ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اُن کے مقصد اور اُن کے سپاہیوں کے نقشِ قدم پر صرف کر سکیں۔

یہ کتاب بھی اسی سوچ اور جذبے سے لکھی گئی ہے۔ اس کے الفاظ کا مقصد کسی انسان کی بڑائی بیان کرنا نہیں، بلکہ اُن شہداء کی قربانیوں کو زندہ رکھنا ہے جنہوں نے اپنے خون سے عزت، غیرت اور دین کی حفاظت کی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں اخلاص کے ساتھ اُن کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق دے اور ہمیں ریا اور دکھاوے سے محفوظ رکھے۔

حقیقی پرواز

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ لوگ اکثر مصنف یا لکھنے والے پر باتیں بنانے لگتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ شہرت کے لیے لکھتا ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی تعریف چاہتا ہے۔ کوئی نیت پر شک کرتا ہے تو کوئی الفاظ پر اعتراض اٹھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیتوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ قیامت کے دن نہ کوئی کسی کے عذر کو سنبھالے گا اور نہ کوئی کسی کے بوجھ کو اٹھائے گا۔ ہر انسان کا حساب اس کی اپنی نیت اور عمل کے مطابق ہو گا۔

یہ کتاب نہ کسی کی ذات کی تعریف ہے اور نہ کسی کی بڑائی کا چرچا، بلکہ ایک آئینہ ہے جو شہداء کی سچی قربانی کو دکھاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں اُن بہادروں کا ذکر باقی رہے جنہوں نے اپنے خون سے وفا کی تاریخ لکھی۔ یہ تحریر ایک دعوت ہے کہ ہم سب اپنے امام کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے خود کو تیار کریں۔

وقت زیادہ دور نہیں۔ وہ گھڑی آئے گی جب امام کے لشکر میں وہی لوگ شامل ہوں گے جنہوں نے اپنے قلم، اپنے قول اور اپنے عمل سے وفا ثابت کی ہو گی۔ اللہ کرے کہ ہم سب اُن خوش نصیبوں میں ہوں جو اُس دن اپنے آقا کے سامنے سر فخر سے بلند کر سکیں۔

کامیابی کے راستے

انسان کی اصل کامیابی کے صرف دو راستے ہیں۔

پہلا راستہ وہ ہے جو امام حسینؑ نے دکھایا—جہاں سر کو تن سے جدا کر دینا کامیابی ہے، یعنی اللہ کی راہ میں شہادت۔

اور دوسرا راستہ وہ ہے جو بی بی زینبؑ اور امام سجادؑ نے دکھایا—جہاں پوری زندگی کو صبر، عبادت اور حق کی گواہی کے لیے قربان کر دینا کامیابی ہے۔

یہ دونوں راستے دراصل ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں: اللہ کی رضا اور اپنے وقت کے امام کی نصرت۔

شہادت کا رتبہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے شہیدوں کے بارے میں فرمایا:

”اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں، مگر تمہیں خبر نہیں۔“

یہ آیت ہمارے دلوں کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ ہم اپنی عقل سے چاہے کتنا بھی غور کریں، ہم اس حقیقت کی گہرائی کو نہیں پا سکتے کہ شہداء کس طرح زندہ ہیں۔ مگر اتنا ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ وہ بالکل ویسے ہی ہماری بیچ موجود ہیں جیسے ہمارے امام زمانہ (عج) زندہ اور موجود ہیں، ہمیں دیکھتے ہیں، ہماری دعائیں سنتے ہیں۔

شہادت دراصل وہ دروازہ ہے جس سے گزر کر ایک عام انسان بھی غیر معمولی رتبے پر فائز ہو سکتا ہے۔ یہ اللہ کا خاص انعام ہے کہ وہ اپنے برگزیدہ بندے کو اس مقام پر سرفراز کرے جہاں وہ دوسروں کی مدد کر سکے، اُن کی دعاؤں کا وسیلہ بن سکے اور اپنے خون سے دین کی بقا کی ضمانت دے سکے۔

شہادت تک کا راستہ

اس رتبے کو پانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی زندگی کو اہلِ بیتؑ کی زندگی کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ جو کام اُنہوں نے کیا اُنہیں اپنانا ہو گا۔ جس چیز سے اُنہوں نے بیزاری کا اعلان کیا اُس سے خود کو دور رکھنا ہو گا۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دل میں شہادت کی طلب کو زندہ رکھنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سے مسلسل یہ دعا کرنا ہو گی کہ وہ ہمیں اپنے دین اور امام کے راستے میں جان قربان کرنے کی سعادت عطا کرے۔

شہداء سے توسل

شہادت کے راستے کو پانے کا ایک اور ذریعہ شہداء کی زندگی کو اپنا نمونہ بنانا ہے۔ اگر ہم کسی شہید کو اپنا وسیلہ بنائیں، اُس کی سیرت کو پڑھیں اور اُس سے توسل کریں، تو یہ بھی شہادت کی راہ ہموار کرنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ ہرگز اس بات کا انکار نہیں کہ ہم امامؑ سے براہِ راست توسل نہیں کر سکتے — بلکہ یہ اُن راستوں میں سے ایک ہے جو

ہمیں امام کے قریب لے جاتے ہیں، کیونکہ شہداء امامؑ کے حقیقی سپاہی ہوتے ہیں اور اُن کی سفارش اللہ کے حضور قبولیت پاتی ہے۔

ہمارے معاشرے کو آج سب سے زیادہ ضرورت اسی سوچ کی ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ کامیابی کو دنیا کے مال، جاہ و منصب میں ڈھونڈتے ہیں، مگر اصل کامیابی یہ ہے کہ ہم اپنے امام کے مقصد کے ساتھ جُڑ جائیں۔ چاہے قلم کے ذریعے ہو، چاہے زبان کے ذریعے، یا چاہے جان دے کر۔

یہ کتاب بھی اسی مقصد کے لیے ہے—تاکہ دلوں میں یہ جذبہ جاگے کہ ہم سب اپنے وقت کے امام کی خدمت میں نکلیں۔ چاہے ایک چھوٹا قدم ہی کیوں نہ ہو، مگر اُسی راہ میں ہو جو ظہور کی زمین کو ہموار کرتی ہے۔

آج کے دور میں ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ اگر ہم میدان میں جان نہ دے سکیں تو کم از کم اپنے وقت کے امام کی راہ میں اپنی محنت، اپنی زندگی اور اپنی توانائیاں ضرور صرف کریں۔ شہادت صرف تلوار کے نیچے آنے کا نام نہیں، بلکہ یہ اپنی خواہشات کو قربان کرنے کا نام ہے، یہ اپنی انا کو مارنے کا نام ہے، یہ اللہ اور امام کی خاطر جینا ہے۔

ہم تمام علماء اور دوستوں کے شکر گزار ہیں جو وقت کے امامؑ کے لشکر میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور ہر لمحہ خدمت کے جذبے میں مصروف ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ یہ کتاب

پڑھنے والے ہر شخص کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہو کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے امام زمانہؑ کی ظہور کی راہ ہموار کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔

کامیابی کا اصل راستہ یہی ہے: یا سر تن سے جدا کر کے حسینؑ کے قافلے میں شامل ہو جاؤ، یا پھر زینبؑ کی طرح صبر اور استقامت کے ساتھ امام کی خدمت کا پرچم بلند کرو۔

شہداء کی عظمت

شہادت ایک ایسا مرتبہ ہے جس تک انسان اپنی خواہش یا منصوبے سے نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دراصل اللہ کی خاص عطا ہے۔ شہداء کو اُس مقام پر پہنچانے والا کوئی انسان نہیں بلکہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ کربلا کی داستان اس حقیقت کو زندہ ثبوت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ جب امام حسینؑ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبرؑ کی لاش سینے پر اٹھائی تو یہ اعلان ہو گیا کہ شہادت انسان کا اپنا انتخاب نہیں بلکہ رب کا انتخاب ہے۔

ہمارے معاشرے میں افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ شہداء کے بارے میں بے بنیاد باتیں کرتے ہیں۔ یہ دراصل اللہ کی پسند پر انگلی اٹھانا ہے، اور اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہو سکتی ہے؟ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شہید کو اللہ خود چنتا ہے۔

حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو کوئی مجھے طلب کرتا ہے وہ مجھے پالیتا ہے، جو مجھے پالیتا ہے وہ مجھے جان لیتا ہے، جو مجھے جان لیتا ہے وہ میرا عاشق ہو جاتا ہے، اور جو میرا عاشق ہو جاتا ہے میں اُس کا عاشق ہو جاتا ہوں، جس کا میں عاشق ہو جاتا ہوں، میں اُسے قتل کر دیتا ہوں، اور جسے میں قتل کر دوں اُس کا خون بہا مجھ پر واجب ہو جاتا ہے، اور اُس کا خون بہا میں خود ہوں۔"

ان جملوں میں شہادت کی حقیقت چھپی ہے۔ شہید اپنی جان خود سے نہیں دیتا، بلکہ اللہ اپنے عاشقوں کو چن کر اپنے راستے میں قربان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت سب سے بڑا رتبہ ہے۔

انسان کبھی معصوم نہیں ہوتا، اس میں کمزوریاں اور خطائیں ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن جب اللہ کسی بندے کی نیت اور اخلاص سے خوش ہو جاتا ہے تو اس کی کمزوریوں کو معاف کر کے اس کو خرید لیتا ہے۔ اللہ کی خریداری ہمیشہ خالص ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک انسان شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے تو یہ اعلان ہوتا ہے کہ اللہ نے اس کے عیبوں کے باوجود اس کی خوبیاں پسند کر لی ہیں۔

کربلا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ امام حسینؑ کے ساتھی عام لوگ تھے، ان میں مختلف پسِ منظر کے افراد شامل تھے، مگر ان کی نیت اور اخلاص نے انہیں شہادت کے

اُس بلند مقام تک پہنچا دیا کہ آج بھی دنیا اُنہیں یاد کرتی ہے۔ یہی شہداء کی اصل عظمت ہے کہ وہ دنیاوی خامیوں کے باوجود اللہ کے دربار میں مقبول ہو جاتے ہیں۔

آج ہمیں یہ سبق لینا ہے کہ شہداء کی قربانیوں کو معمولی نہ سمجھیں۔ اگر ہم واقعی ان کے راستے کے وارث ہیں تو ہمیں ان کی عزت کرنی ہوگی، ان کی یاد کو زندہ رکھنا ہوگا، اور اپنی زندگیوں کو ان کے نقشِ قدم پر ڈالنا ہوگا۔ شہداء کی بے قدری دراصل اپنے ایمان کو کمزور کرنا ہے، جبکہ شہداء کا احترام کرنا ایمان کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے۔

پس! آیئے شہداء کی عظمت کو دل سے تسلیم کریں، ان کے نام پر اپنی سوچ اور عمل کو پاکیزہ بنائیں، اور ان کے راستے کو کربلا کے راستے سے جوڑ کر آگے بڑھائیں۔ یہی وہ عشق ہے جس سے معاشرے میں روشنی اور دلوں میں ایمان زندہ ہوتا ہے۔

پاراچنار کا تعارف

پاراچنار صرف ایک علاقہ نہیں بلکہ قربانی، صبر اور شہادت کی ایک روشن علامت ہے۔ یہ پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا کے شمال مغربی حصے میں واقع ہے اور افغانستان کے خرلاچی بارڈر سے ملا ہوا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ خطہ مختلف اسلامی ممالک کو آپس میں جوڑنے میں کردار ادا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے دشمن

طاقتیں بھی اس علاقے کو بہت اہم سمجھتی ہیں اور اسے ایک ایسی "چابی" تصور کرتی ہیں جو خطے کی طاقت اور توازن کو بدل سکتی ہے۔

پاراچنار کی تاریخ سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔ یہاں کے لوگ کئی آزمائشوں اور مشکلات سے گزرے ہیں۔ کبھی وسائل کی کمی اور دوری کی وجہ سے پریشانیاں آئیں، تو کبھی بڑی طاقتوں کی سازشوں اور سیاسی چالوں نے اس علاقے کو نقصان پہنچایا۔ گزشتہ تیس سالوں میں یہاں کے حالات مزید خراب ہوئے، ترقی رُک گئی، غربت بڑھ گئی، اور لوگوں کو بنیادی سہولیات سے محروم رکھا گیا۔ لیکن ان سب حالات کے باوجود یہاں کے عوام نے صبر، ہمت اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور اپنی پہچان "سرزمینِ شہداء" کے طور پر قائم رکھی۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاراچنار کے شہداء صرف فرقہ وارانہ لڑائیوں میں مارے گئے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ لڑائیاں اصل میں شیعہ سنی کے درمیان نہیں تھیں بلکہ حق اور باطل کے درمیان تھیں۔ تاریخ بھی ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔ مثال کے طور پر جنگِ جمل میں مولا علیؑ نے ان لوگوں سے جنگ کی جو بظاہر مسلمان تھے مگر حقیقت میں منافق تھے۔ بالکل اسی طرح پاراچنار کے لوگ بھی ایسے منافقین اور سازشی عناصر کے خلاف لڑے جنہوں نے فرقہ واریت کا پردہ ڈال کر اپنی طاقت کے کھیل کھیلنے کی کوشش کی۔

پاراچنار کے شہداء کی قربانیاں کسی مسلک یا وقتی سیاست کے لیے نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے، اپنی عزت، اور امن کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہادت آج بھی ایک زندہ پیغام ہے کہ ظلم چاہے کسی بھی شکل میں ہو، اس کا مقابلہ کرنا ہی اصل ایمان ہے۔

پاراچنار کی تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہمیں فرقہ وارانہ اختلافات سے بچ کر، دشمن کے منصوبے پہچان کر، اور تعلیم و شعور کے ذریعے اپنے معاشرے کو آگے بڑھانا چاہیے۔ یہاں کے لوگوں کی قربانیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اتحاد اور قربانی ہی وہ روشنی ہے جو اندھیروں کو ختم کرتی ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاراچنار کے شہداء کو اپنی رحمت میں جگہ دے، وہاں کے حالات بہتر کرے، اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم ان قربانیوں سے سبق سیکھیں اور اپنے معاشرے میں حق و انصاف کے علمبردار بن سکیں۔ آمین۔

گود سے لحد تک

یہ دنیا فانی ہے، مگر کچھ زندگیاں ایسی ہوتی ہیں جو فنا کے پردے میں جا کر بھی باقی رہتی ہیں۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو مٹی اوڑھ کر بھی روشنی بانٹتے ہیں، اور کچھ داستانیں ایسی ہوتی ہیں جو ختم ہو کر بھی آغاز بن جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک داستان ہے شہید

اسحاق حسین آزانچی بنگش کی... ایک ایسی زندگی جو ماں کی گود سے شروع ہو کر شہادت کی لحد پر کربلا کے رنگ میں ڈھل گئی۔

سن 1984 کے جمادی الثانی کی ایک پیر کی صبح، پاراچنار کی فضاؤں میں ایک ننھے مسافر نے آنکھ کھولی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بچہ عام نہیں، عشق کے قافلے کا مسافر ہے۔ وہ قافلہ جہاں منزل فقط قربِ الٰہی ہے اور سفر کی قیمت خون کے قطرے ہیں۔ بچپن سے ہی خاموش مزاج، سکون پسند، اور خدا کی طرف جھکاؤ رکھنے والا یہ بچہ اپنے والدین اور بہنوں کی تربیت سے ایسا پروان چڑھا کہ دو سال کی عمر میں ہی نیکیوں اور اچھائیوں کی طرف مائل ہونے لگا۔ اس کی معصوم نگاہوں میں نور تھا، اور دل میں وہ سکون جو صرف اللہ کے خاص بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔

تعلیم کا سلسلہ اُس زمانے میں مختصر رہا، مگر جو تعلیم مکتبِ حسینؑ اور عشقِ ولایت سے ملی، وہ زندگی بھر اس کا سرمایہ بنی۔ وہ ایک ایسا نوجوان بنا جس کی پیشانی پر تقویٰ کی روشنی، دل میں ایمان کی حرارت اور لبوں پر صداقت کی خوشبو تھی۔ دوست اس کے اخلاق پر فدا تھے، ساتھی اس کی وفاداری کے قائل تھے، اور ہر شخص اس کی سادگی و ایمانداری کو یاد رکھتا تھا۔

زندگی نے ایک موڑ لیا، اور اس معصوم دل کو ہجرت کی آزمائش سے گزارا۔ دبئی کا سفر ہوا، مگر وطن کی محبت اور مٹی کی خوشبو نے اسے واپس بلا لیا۔ جیسے کربلا کے فرزند

شام کے محلوں کو ٹھکرا کر کربلا کی خاک کو گلے لگاتے ہیں، ویسے ہی اسحاق حسین نے بھی دنیاوی سہولتوں کو چھوڑ کر وطن کی سرزمین پر آ کر اپنی تقدیر کے باب لکھنے شروع کیے۔

پھر وہ وقت آیا جب دلاسو کی جنگ میں پہلی مرتبہ وہ محاذ پر کھڑا دکھائی دیا۔ سینہ تا سینہ، نگاہ تا نگاہ، وہ ہر اس صف میں کھڑا ہوتا جہاں موت قریب تر تھی۔ بہادری ایسی کہ گروپ کے سب کمانڈر بھی اس کے حوصلے پر حیران رہ جاتے۔ وضو کے بعد محاذ پر جانا اس کا معمول تھا، گویا ہر گولی، ہر فائر اور ہر زخم اس کے لیے عبادت کا حصہ تھا۔ زخمی ساتھیوں کو کاندھوں پر اٹھا کر نکالتا، ان کے زخموں پر مرہم رکھتا، اور رات کی تاریکی میں بھی ان کی عیادت کو جاتا۔ یہ سب کچھ ایک عام انسان نہیں کر سکتا، یہ صرف وہ کر سکتا ہے جس کے دل میں شہادت کی تڑپ اور خدا کی رضا کی پیاس ہو۔

اور پھر وہ لمحہ آیا جس نے زندگی کے اوراق کو شہادت کی سرخی میں رنگ دیا۔ بگن کے مقام پر جب قافلے پر حملہ ہوا، تو زمین لرزی، آسمان دہلا، اور خون کی بوندیں مٹی کے ذروں میں گھل گئیں۔ شہید کمانڈر اسحاق حسین اس معرکے میں ایسے لڑے جیسے علی اکبرؑ نے کربلا میں نیزوں کے سائے تلے لڑا۔ کوئی خوف، کوئی لرزہ، کوئی ڈر... کچھ بھی نہیں۔ بس ایک ہی صدا لبوں پر تھی کہ "خدایا! میرا خون تیرے دین پر قربان ہو۔"

اسی جنگ کے دوران ایک دن ان کے بھائی نے فون پر کہا:

"اسحاق حسین، تم گھر سے گئے کئی دن ہو گئے ہیں، اب لوٹ آؤ۔"

شہید نے مسکرا کر وہ جملہ کہا جو آج بھی دلوں کو چیر تا ہے:

"بھائی فکر نہ کریں، میں جمعرات کو ضرور آؤں گا۔"

اور ہاں... وہ آیا، مگر کیسا آیا؟

وہ جمعرات ہی کا دن تھا، صبح آٹھ بجے اس کا خون زمین پر گرا، وہ شہادت کے تاج سے سر فراز ہوا، اور رات نو بجے اس کا جنازہ گھر پہنچا۔ وہ وعدہ پورا کر گیا، مگر ایک عجیب اور کربلا نما انداز میں۔ جیسے حضرت قاسمؑ نے کہا تھا: "چچا! موت میرے لیے شہد سے بھی زیادہ میٹھی ہے"، ویسے ہی شہید اسحاق حسین نے موت کو گلے لگایا اور زندہ جاوید ہو گیا۔

جب اس کا جنازہ گھر آیا تو در و دیوار روئے، بہنوں کی آہیں فلک تک گئیں باپ کے آنسو اس کی پیشانی کے بوسے میں ڈھل گئے۔ پورا گاؤں اس لحد کے گرد جمع تھا، جہاں ایک ایسا جسم اتر رہا تھا جو دنیاوی حساب سے خاموش تھا مگر در حقیقت پوری کائنات سے زیادہ بلند آواز میں یہ کہہ رہا تھا:

"میں نے خون دیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں آزادی اور عزت کے ساتھ جی سکیں۔"

گود سے لحد تک، یہ ایک سفر تھا... مگر کیسا سفر! ایک معصوم بچے کی مسکراہٹ سے شروع ہو کر ایک شہید کمانڈر کے خون پر ختم ہونے والا سفر۔ یہ سفر ہمیں سبق دیتا ہے

کہ اصل زندگی وہ ہے جو اللہ کے لیے ہو۔ اصل کامیابی وہ ہے جو قربانی میں چھپی ہو۔ اور اصل موت وہ ہے جو لحد میں اتر کر بھی زندہ کر دے۔

سلام ہو اس مسافرِ عشق پر، جس نے کربلا کے پیغام کو اپنے خون سے زندہ رکھا۔

سلام ہو اس ماں پر جس نے ایک ایسا بیٹا تربیت کیا جو خدا کا سپاہی بن کر مٹی کو روشنی دے گیا۔

سلام ہو اس بہن پر جس کے آنسو کربلا کی زینبؑ کے صبر کی یاد دلا گئے۔

سلام ہو اس باپ پر جس کا سینہ عباسؑ کے باپ کی یاد تازہ کر گیا۔

اور سب سے بڑھ کر، سلام ہو شہید کمانڈر اسحاق حسین آزانچی بنگش پر، جس کی گود سے لحد تک کی کہانی ہر جوان کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

شہید کمانڈر کے والد کی زبانی

اس بیان کو قلم بند کرنے سے پہلے ہم ایک ناقابلِ برداشت منظر کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ہم شہید کے والد سے ان کی زندگی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر اُس وقت تک شہید کے والد کو یہ حقیقت نہیں بتائی گئی تھی کہ اُن کے بیٹے کی شہادت ہو چکی ہے۔ ہاں، وہ جنازے پر ضرور موجود تھے، مگر اُنہیں یہ بتایا گیا کہ یہ جنازہ اُن کے بھائی افضل کا ہے۔

شہید کے والد بینائی کی کمزوری کے باعث پہچان نہ پائے اور شدتِ غم سے نڈھال ہو کر مسلسل گریہ وزاری کرتے رہے۔ اہلِ خانہ کو خدشہ تھا کہ اگر وہ جان لیں گے کہ یہ تابوت اُن کے جواں سال بیٹے کا ہے تو وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں گے۔

ہائے! جیسے کربلا میں حسینؑ نے اپنے اکبرؑ کا لاشہ اٹھایا ہو گا، ویسے ہی ایک باپ کے دل پر یہ قیامت ٹوٹی ہو گی۔

گھر والوں نے والدِ شہید کو بتایا کہ ان کا بیٹا قطر گیا ہے۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے بھی انٹرویو میں یہی کہا، مگر ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ ہم اس عظیم شخصیت کی بہادری اور شجاعت کو کتابی صورت میں محفوظ کرنا چاہتے ہیں تاکہ اُس کی زندگی معاشرے کے لیے ایک روشن مثال بن جائے۔

باپ کے دل کا حال وہی جانتا ہے جس کا جگر کا ٹکڑا اُس کے سامنے چھن جائے۔ کربلا کی سرزمین پر جب امام حسینؑ نے اپنے نوجوان بیٹے علی اکبرؑ کا لاشہ اٹھایا ہو گا، اُس لمحے ایک باپ کے دل پر کیسی قیامت ٹوٹی ہو گی؟ آج کے شہید کا والد بھی کچھ اسی کیفیت سے گزرا۔ اُس کے سامنے جنازہ رکھا گیا، وہ آنسو بہاتا رہا، گریہ کرتا رہا، مگر اُسے یہ بھی نہ بتایا گیا کہ یہ تابوت دراصل اُس کے اپنے بیٹے کا ہے۔

یہی تو والد کی عظمت ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر اولاد کو سہارے دیتا ہے، اُن کی دعاؤں میں جیتا ہے، اور جدائی کے صدمے میں بھی صبر کی دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے۔

معاشرے میں ایک والد وہ ستون ہے جس پر گھر اور خاندان کھڑا رہتا ہے۔ اگر یہ ستون نہ ہو تو چھت بکھر جاتی ہے۔

شہید کے والد کا دکھ صرف ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یہ ہمیں کربلا کی اُس یاد کی طرف لے جاتا ہے جہاں والدین نے اپنے بیٹوں کو دین کے لیے قربان کیا اور صبر کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے مثال قائم کی۔

آج ہمارا معاشرہ بھی ایسے والدین سے سبق لے کہ اپنی اولاد کی تربیت ایمان، غیرت اور قربانی کی راہ پر کرے۔ کیونکہ شہید صرف ماں باپ کا بیٹا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ملت کا سرمایہ اور آئندہ نسلوں کا رہنما بن جاتا ہے۔

والد کی زبانی

میرا بیٹا جمادی الثانی کے مہینے میں، پیر کے دن پیدا ہوا۔ میں نے خود اس کا نام "اسحاق حسین" رکھا۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت خاموش طبیعت کا مالک تھا۔ بچپن میں کھیل کود میں مصروف رہنے کے باوجود کبھی بدزبانی نہ کی۔ میں نے شروع سے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی پرورش اور روش عام بچوں سے بہت مختلف ہے۔

میرے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں، لیکن ان سب میں مجھے اسحاق سب سے زیادہ عزیز تھا۔ ایک تو وہ سب سے چھوٹا تھا، اور دوسرا سب سے نیک اور بااخلاق۔

جب اسحاق حسین سات سال کا ہوا تو اُسے کربلا کی زیارت کا شرف ملا۔ میں اُس کے ساتھ تھا۔ اُس ننھی سی عمر میں اُس نے نہایت سکون اور خاموشی سے پورا سفر کیا۔ روضہ امام حسینؑ اور مولا عباسؑ پر جا کر اس نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے طواف کیا۔ اُس کی معصومیت اور عقیدت دیکھ کر دل خوشی سے بھر جاتا۔

اسکول کے زمانے میں وہ ہمیشہ اسلامی پروگراموں میں بھرپور حصہ لیتا۔ اس کی کارکردگی نہایت شاندار ہوتی، اور میں اُس پر فخر کرتا۔ جب اسحاق 13 سال کا ہوا تو اُس نے کنج علیزئی میں ایک دینی ادارے میں داخلہ لیا اور دین کی خدمت میں لگ گیا۔

17 سال کی عمر میں اُس نے کہا کہ میں پردیس جانا چاہتا ہوں۔ ہم نے اسے روکا کہ تم ابھی چھوٹے ہو، مگر اُس نے کہا: "ابا جان، میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا خرچ اٹھائیں۔" پھر وہ دبئی چلا گیا اور پانچ سال وہاں گزارنے کے بعد واپس آیا۔

واپسی پر ہم نے اُس کی شادی کر دی۔ اُس کی ایک ہی شرط تھی کہ میرا رشتہ ایک عزت دار اور باحیا گھرانے سے ہو۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اچھے مردوں کے لیے اچھی عورتیں ہیں۔ اللہ نے اُسے واقعی ایک باحیا اور نیک ہمسفر عطا کی۔

پاراچنار کی حالت جب خراب ہوئی اور جنگ چھڑ گئی تو وہ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آیا۔ لیکن وہ اپنی بہادری کا ذکر کبھی خود نہ کرتا، ہمیشہ خاموش رہتا۔ البتہ اُس کے

ساتھی، گاؤں کے لوگ اور جنگ میں شریک افراد اُس کی جرات و شجاعت کے قصے سناتے۔ میں جب یہ سنتا تو ایک طرف دل غم سے بھر جاتا مگر دوسری طرف فخر بھی محسوس ہوتا۔

مگر ایک خوف ہمیشہ دل میں رہا بیٹے کی جدائی کا خوف۔ میں اللہ کی رضا پر راضی رہا، مگر دل کی بے چینی کم نہ ہوئی۔

اسحاق جب قطر گیا تو مجھے اُس کی بہت یاد آئی۔ وہ جاتے وقت مجھ سے کیوں نہ ملا؟ وہ جب بھی بازار جاتا تو مجھ سے پوچھتا، "دادا، آپ کو کچھ چاہیے؟" اور شام کو ضرور لے آتا۔ یہ یاد کرتے کرتے میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

کتنا پُر درد ہے کہ ایک والد کو یہ بھی نہ بتایا گیا کہ اس کا بیٹا کیوں نہیں آیا۔ اُس کو یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا بیٹا، اُس کا سب سے چھوٹا اور سب سے پیارا بیٹا، اللہ کی راہ میں شہید ہو چکا ہے۔

یہ تحریر صرف ایک والد کے درد کی نہیں، بلکہ ہر اُس باپ کا نوحہ ہے جو اپنے جگر کے ٹکڑے کو دین کی راہ میں قربان کر دیتا ہے۔ شہید صرف ایک گھرانے کا نہیں ہوتا، وہ پورے معاشرے کا سرمایہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتاہ

باپ کے دل کا حال وہی جانتا ہے جس کا جگر کا ٹکڑا اُس کے سامنے چھن جائے۔ کربلا کی سرزمین پر جب امام حسینؑ نے اپنے نوجوان بیٹے علی اکبرؑ کا لاشہ اٹھایا ہو گا، اُس

لمحے ایک باپ کے دل پر کیسی قیامت ٹوٹی ہو گی؟ آج کے شہید کا والد بھی کچھ اسی کیفیت سے گزرا۔ اُس کے سامنے جنازہ رکھا گیا، وہ آنسو بہاتا رہا، گریہ کرتا رہا، مگر اُسے یہ بھی نہ بتایا گیا کہ یہ تابوت دراصل اُس کے اپنے بیٹے کا ہے۔

یہی تو والد کی عظمت ہے کہ وہ اپنی زندگی بھر اولاد کو سہارے دیتا ہے، اُن کی دعاؤں میں جیتا ہے، اور جدائی کے صدمے میں بھی صبر کی دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے۔ معاشرے میں ایک والد وہ ستون ہے جس پر گھر اور خاندان کھڑا رہتا ہے۔ اگر یہ ستون نہ ہو تو چھت بکھر جاتی ہے۔

شہید کے والد کا دکھ صرف ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یہ ہمیں کربلا کی اُس یاد کی طرف لے جاتا ہے جہاں والدین نے اپنے بیٹوں کو دین کے لیے قربان کیا اور صبر کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لیے مثال قائم کی۔

آج ہمارا معاشرہ بھی ایسے والدین سے سبق لے کہ اپنی اولاد کی تربیت ایمان، غیرت اور قربانی کی راہ پر کرے۔ کیونکہ شہید صرف ماں باپ کا بیٹا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ملت کا سرمایہ اور آئندہ نسلوں کا رہنما بن جاتا ہے۔

شہید کی شریکِ حیات

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسحاق حسین کے گھر والے رشتے کے لیے تین بار آئے تھے۔ تیسری بار یہ رشتہ پکا ہوا—میرے لالا (میرے والد) اور میرے چچاوں نے اس لڑکے کے بارے میں پوری تحقیق کی: سیرت، صورت، گھرانے کے حال، سب کچھ جانچا گیا۔ وہ سب مطمئن تھے کہ لڑکا نیک اور شریف ہے۔

میرے لالا (والد) نے میرے کمرے میں آکر کہا:

"بیٹی، میں نے تمہیں بڑے پیار سے پالا ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم ایسے گھر میں جاؤ جو اچھا نہ ہو۔ میں نے اسحاق حسین کے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہے۔ وہ اچھا اخلاق، رحم دل اور نیک سیرت کا مالک ہے۔ اس کا خاندان بھی شایستہ اور باعزّت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسی سے نکاح کرو۔"

میں اُس وقت بہت شرمیلی تھی، چپ رہ گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر میں نے کہا:

"جو فیصلہ آپ اور میرے گھر والوں کو منظور ہو، وہی مجھے بھی منظور ہے۔"

میرے لالا نے پھر اسحاق حسین کے بھائی علی اضغر کو فون کیا اور کہا کہ ہماری رشتہ داری منظور ہے۔ آپ کل کاغذات کے لیے آجایئے۔ پانچ یا چھ دن بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد ہم نے فون پر بھی باتیں شروع کیں۔ جب اسحاق مجھے پہلی بار فون پر بولا تو مجھے وہی ملا جو میں ہمیشہ چاہتی تھی۔ ایک نرم دل، نیک، اور پرہیزگار ہمسفر۔ وہ اکثر اسلام اور تقویٰ کے بارے میں بات کرتا، کہتا تھا کہ مجھے حیاء والی عورت پسند ہے اور اس کا لباس اسلام کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر کال دیر سے آتی تو میں بے چینی محسوس کرتی، لیکن جب وہ بات کرتا تو میرے دل کو سکون ملتا۔

شادی کی تیاری میں میں نے اپنے سسرال کے لیے سامان خریدا۔ میرے سسرال والے کبھی مجھے ناراض نہیں کرتے تھے۔ جیسے میں اپنے گھر میں لور تھی، ویسے ہی اسحاق بھی اپنے گھر کا لور تھا۔ اس کے گھر والے میرے بارے میں کہتے، "یہ اسحاق کی بیوی ہے، اسے جلدی خفامت ہونے دو۔" ہم دونوں بہت خوش تھے۔

وہ نہایت پرہیزگار، متقی، بااخلاق اور رحم دل انسان تھا۔ وہ میرے ہر چھوٹے بڑے کام کا خیال رکھتا، میری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔

جب ڈلیوری کا وقت آیا تو میں نے سب سے پہلے سیدہ فاطمہ زہراءؓ کو یاد کیا، پھر اپنے شوہر کو۔ دعا کرتی رہی کہ کاش وہ اسی وقت میرے ساتھ ہوتا۔ بچہ پیدا ہونے پر جو سکون اور خوشی ملی، بیان سے باہر ہے۔ ہسپتال سے جب باہر آئی تو اسحاق میرے انتظار میں تھا—وہ خوش تھا، میں خوش تھی۔ گھر پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ بچے کے پاؤں پر

ذوالفقار کی مانند نشان تھا، اسی لیے فیملی نے مشورہ کیا کہ نام 'علی جی' رکھا جائے۔ اور اسحاق کو یہ نام بہت پسند آیا۔

اس کے بعد ہمارے گھر میں خوشی رہی۔ پھر دو سال بعد ایک بیٹی ہوئی۔ اس کا نام اسحاق نے خود رکھا: بصرہ (یعنی بصیرت والی)۔ پھر ڈھائی سال بعد دوسری بیٹی پیدا ہوئی اور اس کا نام اس نے رکھا نورِ فاطمہ، اور بعد ازاں تیسری بیٹی ہوئی جسے اس نے انسِ فاطمہ کا نام دیا۔ یوں ہمارے گھر میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہو گئیں۔

اسحاق بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ جب بازار جاتا تو ہر ایک کے لیے الگ سے چیزیں لے کر آتا۔ بچے جب تھکے ہوئے والد کو دیکھتے تو دوڑ کر اسے گلے لگا لیتے—اس کی تھکن بھی جیسے لمحوں میں مٹ جاتی۔ رات کے کھانے میں وہ خود بچوں کے ساتھ کھاتا، ان کے ہر چھوٹے درد کا خیال رکھتا، وقت پر ڈاکٹر کے پاس لے جاتا اور دوا بھی خود دیتا۔ بچوں کی تعلیم کا بہت خیال تھا۔ وہ فیس، ٹیوشن اور قرآن کی کلاسوں تک کا خرچہ خود دیتا۔

وہ غریبوں کا بہت مددگار تھا۔ بازار یا کسی بھی جگہ جب کوئی محتاج ملتا تو وہ ہاتھ بڑھا دیتا۔ پیسے سے ہو یا کسی اور طریقے سے، مگر مدد ضرور کرتا۔ جب ہم زیارت کے سفر پر جاتے تو وہ ہر کسی کا ہاتھ پکڑ کر رہنمائی کرتا؛ قافلے والے کہتے کرتے تھے کہ ہمارے قافلے کا سالار اسحاق حسین ہے۔ ہر کسی کی رہنمائی، ہر کسی کی تکلیف میں وہ ساتھ ہوتا۔

میں اس کی ہمدردیوں کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی؛ بعض اوقات سوچتی ہوں کہ شاید وہ انسان کی شکل میں کوئی فرشتہ تھا۔ وہ نامحرم کی طرف نگاہ بھی نہیں کرتا تھا؛ اپنی نگاہوں کی حفاظت کرتا، خاموشی سے اپنا راستہ اختیار کرتا۔ جب ہم زیارت پر گئے تو پورے سفر میں اس نے کسی نامحرم خاتون کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا—کبھی بات نہ کی۔

ہماری زندگی خوشگوار گزر رہی تھی، مگر جب ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا—تری مینگل کے اسکول میں تین اساتذہ اور چار مزدور بے دردی سے شہید کیے گئے—تب سے اسحاق کا چہرہ بدل گیا۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا؛ کھانا کم کھانے لگا، باتیں کم ہونے لگیں، خاموشی میں گھرا رہا۔ پھر بغداد میں جب جنگ شروع ہوئی تو وہ ہمارے سامنے کہنے لگا کہ وہ جانا چاہتا ہے۔ میں نے رو کر کہا: "آپ جنگ مت جایئے!" اس نے بڑے پیار سے کہا: "نہیں بیوی، مجھے شہادت عزیز ہے، میں چاہتا ہوں مَیں شہید ہو جاؤں۔" وہ الفاظ میرے پاؤں تلے زمین ہلا کر رکھ گئے، مگر میں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ آخرکار وہ جنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔

وہ اکثر سخت ترین محاذ خود چنتا، اور ہر بار چل پڑتا۔ جب بوشہرہ کا محاذ چل نکلا تو وہ گھر سے تیار ہو کر گیا—اس وقت وہ خاص طور پر حسین، دلکش اور خوشبوؤں سے مہکا

ہو الگ رہا تھا۔ میرے دل میں عجیب سا خوف تھا کہ شاید یہ واپسی آخری ہو۔ میں نے اور میری نند نے زور لگا کر کہا کہ اس بار مت جانا، مگر اس نے ہمیں تسلی دی اور روانہ ہو گیا۔

صبح وہ جلدی اٹھا، کچھ کام کر کے آیا۔ تھکا ہوا تھا، پاؤں دھونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد فون آیا؛ اس نے کہا کہ بگن کے مقام پر کنوئے پر حملہ ہوا ہے، ہم وہاں جا رہے ہیں۔ ہم نے سب تیاریاں کر لیں۔ دوست بار بار فون کر رہے تھے کہ جلدی کرو، جلدی کرو۔ وہ جب گھر سے نکلا تو پلٹ کر بچوں کو تک کر بھی نہ دیکھا—ایسا لگا جیسے اس کی محبت شہادت کے عشق کے سامنے چھوٹ جاتی ہو۔

وہ موٹر سائیکل پر اپنے گروپ کے ساتھ گیا۔ شاید ایک یا دو دن بعد لڑائی چھڑ گئی۔ مجھے اسحاق سے آخری دو دن پہلے بات بھی ہوئی۔ اس نے کہا کہ جمعرات کو ضرور آؤں گا۔ جمعرات کے دن ہم سب بے حد خوش تھے؛ گھر سجایا، روزہ بھی رکھا، سب انتظار میں تھے۔ لیکن افسوس کہ جب ظہر کے بعد اعلان ہوا تو کمر سے جیسے زمین کھسک گئی۔ اعلان میں شہید اسحاق حسین کا نام لیا گیا۔

جب وہ اطلاع پہنچی تو پل بھر میں ہوا بدل گئی۔ گھر میں جیسے وقت ٹھہر گیا—دلوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ میری دنیا ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی؛ بچوں کی چیخیں، روتے لوگوں کی آہ و فغاں، اور پڑوس والوں کی ہجوم نے کمر توڑ دی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر آنکھوں سے ہر شے دھندلی ہو گئی۔ لوگ آئے، ہاتھ پکڑ کر تسلی دینے

لگے مگر تسلی کہاں تھی؟ تابوت اٹھایا گیا تو میرے پاؤں کانپنے لگے — اس کے لمس کی کمی، اس کی ہنسی کی گونج، سب کچھ ایک دم سانسوں سے دور ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو آخر بار دیکھا — وہ اک خاص سکوت اور راحت لیے ہوا تھا، ایسے لگا جیسے وہ اپنے محبوب کے پاس جارہا ہے۔

جو درد میں نے اس لمحے محسوس کیا وہ الفاظ میں بند نہیں ہو سکتا۔ ایک ایسی خالی جگہ جو کبھی پوری نہ ہو سکے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس نے اپنے فریضے کو پورا کیا، وہ شجاعت اور قربانی کا نشان بن گیا۔ مگر میرے لیے وہ صرف میرا شوہر، بچوں کا باپ، میرا ساتھ تھا۔ اس کی غیر موجودگی کا خلاء ہر پل محسوس ہوتا ہے۔

اب بھی کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ شاید وہ واقعی کسی فرشتہ کا روپ تھا۔ اس کی یاد ہمارے گھر کے ہر کونے میں بسی ہوئی ہے — اس کی ہمدردی، اس کی محبت، اس کی عبادت، اس کا ہر عمل ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔

اللہ اس پر رحمت فرمائے اور ہمیں صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

شہید کی بہن کی زبانی

شہادت کی خوشبو صرف محاذ پر نہیں، بلکہ گھروں کی دیواروں، ماؤں کی دعاؤں، بہنوں کی آنکھوں اور بچوں کی مسکراہٹوں میں بھی رچ بس جاتی ہے۔ یہی خوشبو ہمارے دلوں کو جلائے رکھتی ہے، یہی آنسو ہمارے زخموں کو تازہ رکھتے ہیں۔

میرا بھائی اسحاق حسین... وہ صرف میرا بھائی نہیں تھا، بلکہ پورے معاشرے کا چراغ تھا۔ اللہ کی محبت اس کے وجود میں یوں رچی بسی تھی کہ ہر وقت اس کے لبوں پر صبر، توکل اور خدا پر اعتماد کے الفاظ ہوتے۔ ہم سب بہن بھائی اس کی باتوں سے طاقت لیتے تھے۔ وہ ہمیشہ کہتا:

"مشکل میں صبر رکھو، اللہ پر بھروسہ رکھو، اس کے فیصلوں میں مصلحتیں چھپی ہوتی ہیں۔"

بوشہرہ کی جنگ سے پہلے ہی ہمیں پتا چلا کہ میرا بھائی لشکر مختار گروپ کا کمانڈر بنایا گیا ہے۔ جب یہ خبر میرے کانوں میں پڑی تو دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے محاذ کے وہ منظر گھومنے لگے جہاں میرا بھائی صفِ اوّل میں سب سے آگے کھڑا ہوتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا:

"اب اس کا راستہ اور زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔"

گھر والے ناراض بھی ہوئے، ڈرے بھی، مگر کمانڈر کی ذمہ داری ایسی تھی کہ ہم سب جانتے تھے اس کی راہ واپسی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم زیادہ دیر تک اس سے ناراض نہ رہ پاتے، کیونکہ محبت کا رشتہ ہر بار غصے پر غالب آجاتا تھا۔

مجھے یاد ہے وہ دن جب میرا بھائی بازار سے جلدی گھر آیا۔ کالے کپڑے پہنے، سامان تیار کیا اور جلدی سے نکلنے لگا۔ میں نے روکا، کہا:

"اسحاق، اس بار مت جاؤ۔ دیکھو تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں..."

وہ مسکرایا، جیسے موت سے وعدہ کر رہا ہو:

"فکر نہ کرو، ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ جب تک ایران، عراق اور شام کی زیارت نہ کرلوں، شہید نہیں ہوں گا۔"

اس کے الفاظ نے میرے دل کو کاٹ ڈالا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا سامان دیا اور وہ روانہ ہو گیا۔

بوشرہ کی لڑائی کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کا جسم مٹی اور خون سے لت پت تھا۔ میں گھبرا گئی کہ زخمی نہ ہو گیا ہو۔ مگر وہ مسکرا کر بولا:

"یہ میرا خون نہیں، یہ ان زخمیوں کا خون ہے جنہیں میں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لایا ہوں۔"

پھر بتایا کہ کیسے حضرت عباسؑ کے توسل سے اللہ نے اسے طاقت دی کہ وہ بار بار زخمیوں کو دشمن کی گولیوں کے بیچ سے نکال کر لاتا رہا۔ وہ لمحہ میرے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔

پھر وہ دن آیا جب اس نے زیارت کی خواہش ظاہر کی۔ کہنے لگا:

"میں اکیلا نہیں جاؤں گا، بیوی اور بچے ساتھ ہوں گے۔"

میں نے کہا:

"راستے خطرناک ہیں، ابھی مت جاؤ۔"

مگر اس نے امام حسینؑ کا قول سنایا:

"جو اکیلا میری زیارت پر آئے گا، میں اکیلا اس کے قبر میں آؤں گا۔ اور جو اپنے پورے خاندان کے ساتھ آئے گا، میں پورے خاندان کے ساتھ اس کی قبر پر آؤں گا۔"

ان الفاظ کے بعد ہم خاموش ہو گئے۔ سب جانتے تھے کہ اس کے فیصلے کے آگے کوئی نہیں چل سکتا۔

روانگی کے دن اس نے گھر کو مہمانوں سے بھر دیا۔ جیسے اپنی آخری ضیافت دے رہا ہو۔ صبح جب اس نے کالے کپڑے پہنے تو اس کا چہرہ نورانی لگ رہا تھا۔

زیارت کے بعد جب وہ واپس آیا تو چہرے پر نور اور جسم پر کمزوری نمایاں تھی۔
زائرین کے قافلے کو ہنگو میں روک دیا گیا، دہشت گردوں کی دھمکیاں عام تھیں۔
میں نے قنوت میں ہاتھ اٹھائے تو دل میں خیال آیا:
"کاش یہ خواب جھوٹ ہو، کاش یہ جنازہ میرے سامنے نہ آئے۔"
مگر خواب سچ ہوتے گئے۔ میں نے دو دانت ٹوٹنے کا خواب دیکھا، پھر بھائی کے کمرے کی دیوار گرنے کا۔ دل میں ایک انجانی وحشت پھیل گئی۔
زیارت سے واپسی کو ابھی چالیس دن بھی نہ ہوئے تھے کہ بگن میں کنوائی پر حملہ ہوا۔ بچوں، عورتوں، بوڑھوں کو بے دردی سے شہید کیا گیا۔ میرا بھائی اس وقت بازار میں دکان پر تھا۔ نہ جانے کس نے خبر دی، وہ بھاگا اور جنگی سامان مانگا۔
اس بار اس نے خود سامان تیار نہ کیا بلکہ فون پر کہا:
"میری تیاری کر دو۔"
یہ الفاظ عجیب لگے۔ میں نے قرآن مجید لیا تاکہ وہ اس کے نیچے سے گزرے۔ وہ تیزی میں گزر گیا مگر چوم نہ سکا۔ میرا دل بیٹھ گیا کہ اب کی بار میرا بھائی واپس نہیں آئے گا۔
میں نے سات قسم کا صدقہ نکالا۔ مگر تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

جمعرات کے دن صبح آٹھ بجے وہ شہید ہوا۔ اسی دن رات نو بجے اس کا جنازہ ہمارے گھر پہنچا۔ وہ وعدہ نبھا گیا جو اس نے کہا تھا:

"میں جمعرات کو ضرور آؤں گا۔"

ہاں، آیا... مگر کفن میں لپٹا، تابوت میں سویا، اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند تھیں۔

شہادت کی خبر

میں اس وقت گھر کے کاموں میں مصروف تھی جب اچانک شور سنائی دیا۔ بہن اور بھابھی کے رونے کی آوازیں... اور پھر کسی نے کہا:

"اسحاق حسین شہید ہو گیا۔"

دنیا تھم گئی۔ زمین قدموں سے نکل گئی۔ میں نے سوچا:

"نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ وہ کہہ کر گیا تھا کہ جمعرات کو آؤں گا۔ شہید کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ زندہ ہے، ضرور زندہ ہے..."

مگر جب تابوت دروازے پر آیا، سب آنکھوں نے گواہی دی کہ وہ سچ میں وعدہ پورا کر کے آیا ہے۔

اسحاق حسین صرف ہمارا بھائی نہ تھا، وہ قوم کا سپاہی تھا، حرمِ اہل بیتؑ کا خادم تھا، غریبوں کا سہارا اور مظلوموں کا مسیحا تھا۔ آج اس کی شہادت ہمارے لیے ایک پیغام

ہے کہ زندگی کی اصل قیمت صرف اللہ اور اس کے دین کے لیے قربان ہونے میں ہے۔

اس کا سفر گود سے لحد تک ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا فانی ہے، مگر شہادت کی خوشبو باقی رہتی ہے۔ وہ خوشبو جو ہمارے دلوں کو تڑپاتی ہے اور ہماری آنکھوں کو ہمیشہ نم رکھتی ہے۔

شہید کی بہن کی زبانی

میرا بھائی اسحاق حسین صرف تیرہ دن کا تھا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہاں گولیاں بہت زیادہ گرتی تھیں۔ میری والدہ مجھے اور بھائی کو لے کر قریبی گاؤں سید بابا کی زیارت چلی گئیں کیونکہ وہاں نسبتاً سکون تھا۔ ہم شام کو گھر آتے اور صبح پھر زیارت چلے جاتے۔ یہ سلسلہ چھ دن تک جاری رہا۔ جب جنگ کی شدت کم ہوئی تو ہم اپنے گھر واپس آ گئے۔

میرے بھائی کے چہرے پر تین نمایاں خال تھے۔ جب بھی بزرگ انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ کامیاب لوگوں کے چہروں پر ہی ہوتے ہیں۔

وہ نماز کے بہت شوقین تھے۔ مجھے یاد ہے جب بھائی نو سال کا ہوا تو میرے ساتھ جائے نماز پر بیٹھ جاتا اور سجدے میں سر رکھ دیتا۔ جب اس کی عمر کچھ اور بڑھی تو

ہمارے والدین کے ساتھ اسے کربلا کی زیارت کا شرف بھی ملا۔ اس کم سنی میں زیارت کے بعد اس نے کبھی نماز قضا نہیں کی۔ وہ ہر دن صبح باقاعدہ اٹھ کر نماز ادا کرتا تھا۔

جوانی میں بھی وہ دن کی تمام نمازیں مسجد میں ادا کرتا۔ اس کی پوری زندگی نماز کو سب سے زیادہ اہمیت دینے میں گزری۔ بڑے بڑے کام چھوڑ کر بھی نماز کو مقدم رکھتا۔ اس کی زندگی ہر حرام چیز سے پاک تھی۔ جب بھی ہم اسے کوئی چیز دیتے تو وہ فوراً پوچھتا: یہ کہاں سے آئی ہے؟ کس نے دی ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھائی ہمیشہ ڈرتا تھا کہ کہیں ناجائز رزق اس کے پیٹ میں نہ جائے۔

ایک عادت یہ بھی تھی کہ جب ہم سب بیٹھتے اور کوئی کسی کی برائی کرتا تو وہ فوراً منع کر دیتا۔ اکثر یہ جملہ دہراتا کہ "جو شخص غیبت کرتا ہے، اس کی نیکیاں اس کے نامہ اعمال سے نکل کر اس کے حصے میں جاتی ہیں جس کی غیبت کی جا رہی ہے۔"

میرے بھائی کو یتیموں سے بہت محبت تھی۔ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرتا تھا۔ محلے کے جتنے یتیم تھے ان سب کا خیال رکھتا تھا۔ وہ مدد اس طریقے سے کرتا کہ کسی دوسرے کو خبر تک نہ ہوتی۔ ایک ہمسایہ بہن مجھے کہا کرتی تھی: "تمہارا بھائی بہت اچھا ہے۔ میرے بیٹے کو، جو بے روزگار تھا اور کمانے والا واحد سہارا تھا، اس نے چند لاکھ روپے دیے اور عراق بھیج دیا تاکہ وہ روزگار کما سکے۔ بعد میں جب ہمارا حال بہتر ہوا تو ہم نے وہ پیسے واپس کر دیے۔"

شہداء کے اہل خانہ کی مدد میں بھی وہ ہمیشہ آگے رہتا۔ بھائی کی ایک دکان تھی جہاں میرا بھانجا کاشف علی کام کرتا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ جب بھی کسی شہید کا والد، بھائی یا بیٹا دکان پر کچھ خریدنے آتا تو ماموں اکثر وہ سامان بغیر پیسے لیے دے دیتے۔ کاشف کہتا ہے: "میں فقیر کو بیس یا تیس روپے دیتا تو ماموں کہتے اتنے کم مت دو کہ وہ رات کا کھانا بھی نہ کھا سکے۔ اتنے دو کہ کم از کم ایک وقت کا کھانا عزت سے کھا سکے۔"

رمضان میں وہ اکثر دستر خوان بچھاتا، غریبوں کو بلاتا اور کھانا کھلاتا۔ لوگ شہید کی محبت میں خوشی سے دعوت قبول کرتے۔

شہادت کے بعد جب ہم نے بھائی کی تصویر دکان پر لگائی تو جو بھی فقیر یا غریب آتا، تصویر دیکھتے ہی رونے لگتا۔

میرے بھائی کے دوست ہمیشہ نیک اور صاف دل ہوتے۔ جب بھی دوستوں کے ساتھ گھومنے جاتے تو ہمیشہ پاکیزہ اور پرسکون جگہوں کا انتخاب کرتے، جیسے علی زیارت یا ملانے عباس کی زیارت۔ وہاں زیادہ کھانا پکاتے اور کہتے: "یہ ممکن ہی نہیں کہ میں خود کھاؤں اور اپنے گھر والوں کو نہ کھلاؤں۔" وہ کھانا لازمی گھر لے آتے۔ رشتہ داروں کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کرتے اور اگر کسی میں جھگڑا ہوتا تو بڑے پیار اور حکمت سے میل ملاپ کراتے۔

شہید اہلِ بیتؑ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ محرم آتے ہی ان کی حالت بدل جاتی۔ وہ سیاہ لباس پہنتے، گریبان کھلا چھوڑتے اور ہر ممکن کوشش کرتے کہ کوئی مجلس نہ چھوٹے۔ دکان کا کام چھوڑ کر مجلس میں جاتے، پھر واپس دکان پر آتے اور شام کو گھر۔ نماز مغرب کے بعد مرکزی امام بارگاہ میں مجلس کے لیے نکلتے، وہاں عزاداروں کی خدمت کرتے اور کئی گھنٹے کھڑے رہتے۔ تین دن محرم میں مسلسل شب بیداری کرتے۔ ہر ماہ کی شبِ جمعہ کو راہ چلتے لوگوں کے لیے شربت کا انتظام کرتے اور محرم میں یہ سلسلہ ہر دن جاری رہتا۔

جنگوں میں شرکت

جب تری مینگل کے واقعے میں اساتذہ اور مزدوروں کو شہید کیا گیا تو یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی۔ یہ پاراچنار کی تاریخ کا سب سے دردناک واقعہ تھا جس کی وجہ سے ان شہداء کو "شہداء قلم وکتاب" کہا گیا۔ اس واقعے کے بعد میرے بھائی کے دل میں آگ جلنے لگی۔

۴ مئی کے واقعے کے بعد پاراچنار کے حالات مزید بگڑ گئے اور مختلف علاقوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں۔ بھائی بعدی کے محاذ پر گئے۔ ایک رات جنگ سے واپس آئے تو تھکے ہوئے لیکن چہرے پر اطمینان تھا۔ کہنے لگے: "آج ہم نے شہداء قلم وکتاب کا بدلہ

لے لیا ہے۔" اس کے بعد جب بھی کوئی جنگ چھڑتی یا ظلم ہوتا، بھائی فوراً شریک ہوتے اور ہمیشہ سخت ترین محاذ کا انتخاب کرتے۔

شہادت کی اطلاع

بھائی کی شہادت کی خبر نہایت ہی دل خراش تھی۔ اسی دن مجھے اندر سے ایک انجانا خوف کھائے جا رہا تھا کہ میرا بھائی مجھ سے جدا نہ ہو جائے۔ اس دن میں نے بھائی کی سلامتی کے لیے روزہ رکھا تھا۔ دوپہر کو محلے میں اچانک شور مچا۔ پتہ چلا کہ ہمارے پڑوسی زاہد شہید ہو گئے ہیں۔ لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں بار بار سب سے پوچھتی کہ کیا میرا بھائی واپس آئے گا؟ وہ تو زندہ ہو گا نا؟ میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی "اناللہ وانا الیہ راجعون، میرا بھائی ضرور آئے گا۔"

مگر نصیب کو کچھ اور منظور تھا۔ مسجد سے اعلان ہوا: "اسحاق حسین شہید ہو گئے ہیں۔"

یوں میرا بھائی ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اللہ کی راہ میں زندہ ہو گیا۔ اس کی جدائی نے دل کو چیر دیا لیکن یہ سکون ہے کہ وہ اپنی شہادت کی منزل پر فائز ہوا۔

شہید کے بھائی کی زبانی

راوی: علی اصغر آزانچی

میرا شہید بھائی بچپن ہی سے نماز کا پابند اور خاموش مزاج کا مالک تھا۔ نہ وہ کسی سے جھگڑتا، نہ کسی کے دل کو دکھاتا۔ اتنا صابر انسان تھا کہ کبھی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دل کو خفا کیا ہو۔

شہید بھائی کو کھیلوں سے بھی محبت تھی، خاص طور پر والی بال اور فٹ بال سے۔ بازار سے آنے کے بعد اگر کوئی ضروری کام نہ ہوتا تو لازمی کھیل کے میدان میں نظر آتا۔ لیکن اس سب کے ساتھ وہ ہمیشہ معصومینؑ کے اقوال پر عمل کرنے والا تھا، اور اپنی کمائی اور زندگی کو دین کے اصولوں کے مطابق گزارتا۔

ہم سب بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا، اس لیے ہم سب اُس پر پیار لٹاتے۔ میں دبئی میں محنت مزدوری کرتا اور اکثر چاہتا کہ کچھ پیسے الگ سے اُسے بھیج دوں تاکہ وہ آرام سے گزارہ کرے۔ لیکن میرے شہید بھائی نے کبھی دوسروں پر انحصار نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ کہتا:

"میں خود اپنی کمائی کروں گا، مجھے دوسروں کے سہارے جینا پسند نہیں۔"

سترہ اٹھارہ سال کی کم عمری میں ہی اُس نے سخت محنت کی اور کئی سال دبئی میں گزارے۔ وہاں بھی اُس کی نرمی، اخلاق اور محنت نے ہر کسی کے دل کو جیت لیا۔ لوگ اُسے اپنے گھروں پر دعوت دیتے، اُس کے ساتھ بیٹھنا باعثِ سکون سمجھتے۔ اُس کے پاس جو کچھ ہوتا، وہ دوسروں کے ساتھ بانٹتا۔ کچھ اپنے پاس رکھتا اور باقی غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔

مجھے یاد ہے، ہمارے خاندان میں زمین کا ایک بڑا جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر یہ معاملہ طول پکڑتا تو خون خرابے تک جا سکتا تھا۔ لیکن میرے شہید بھائی نے نرمی، عقل اور صبر کے ساتھ دونوں فریقوں کو راضی کیا اور تنازع ختم کر دیا۔ اُس نے پودے اکھڑوا کر دونوں کو واپس کیے تاکہ کسی کے دل میں کینہ نہ رہے۔ اُس وقت میں نے سوچا: واقعی، اللہ ایسے ہی جوانوں کو اپنی راہ میں چن لیتا ہے۔

شہید بھائی کو مجالسِ عزاء سے عشق تھا۔ دبئی ہو یا پاراچنار، گرمی ہو یا سردی، وہ کبھی مجلس سے غافل نہیں ہوا۔ اکثر دوستوں کے ساتھ مل کر کئی گھنٹے مجلس کے محافظ کے طور پر کھڑا رہتا تاکہ عزاداروں کو سہولت ہو۔ محرم اور صفر میں وہ گلیوں اور امام بارگاہوں کو بڑی محبت سے سجاتا۔

جب محاذ کی بات آتی تو ہمیشہ سب سے سخت مورچے کا انتخاب کرتا۔ ہم سب بہن بھائی اُس کے لیے پریشان رہتے۔ ایک بار میں نے اُس سے کہا:

"بھائی! آپ کے بچے ہیں، آپ آسان محاذ کیوں نہیں چنتے؟"

اُس نے خاموشی سے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اُس نظر میں شہادت کا خواب جھلک رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا:

"اگر میں نہ جاؤں اور میرے ساتھی نہ جائیں، تو پھر کون جائے گا؟ کیا ہم صرف اپنے بھائیوں اور بہنوں سے محبت کریں اور اپنی قوم کو بے سہارا چھوڑ دیں؟ اگر ہم نہ لڑیں تو دہشتگرد ہماری ماں بہنوں کی عزتیں لوٹ لیں گے، اور ہم صرف تماشائی بنے رہیں گے؟"

اُس کی باتوں نے میرے دل کو چیر ڈالا۔ وہ خاموشی سے محاذ پر روانہ ہو گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔

جمعرات کی صبح، وہ بگن کے محاذ پر شہید ہوا۔ اُس کا وعدہ سچا نکلا۔ اُس نے کہا تھا:

"میں جمعرات کو ضرور آؤں گا۔"

ہاں، وہ آیا... لیکن کفن میں لپٹا، جنازے کی صورت۔

شہید کے بھائی منیر حسین آزانچی کی زبانی

میرا شہید بھائی بچپن ہی سے نمازی اور پاکیزہ عادات والا تھا۔ وہ صفائی کا بہت خیال رکھتا اور زیادہ باتوں میں نہیں پڑتا تھا۔ زیادہ تر خاموش رہتا اور دوسروں کی فکر میں رہتا۔

جب ہم دبئ میں ساتھ رہتے تھے تو اگر کوئی ساتھی بیمار ہوتا، شہید بھائی اُس کی خدمت کرتا، دوا دیتا اور دیکھ بھال کرتا۔ کام سے واپس آنے پر جب سب آرام کرنے لگتے، تو وہ سیدھا باورچی خانے میں جاتا، کھانا گرم کرتا اور دستر خوان بچھاتا۔

اُس کی سب سے نمایاں صفت غریب نوازی تھی۔ جتنا بھی کمایا، اُس میں سے زیادہ تر غرباء پر خرچ کر دیتا۔ دکان پر اگر کوئی غریب آتا تو اُسے مفت سامان دے دیتا۔ کھیتوں میں جا کر مزدوروں کے ساتھ بلا معاوضہ کام کرتا۔ ہمسایوں کو قرض دیتا، تاکہ وہ بیرونِ ملک جا سکیں اور اپنے گھروں کا سہارا بن سکیں۔

وہ اختلافات کو ختم کرنے والا شخص تھا۔ لوگ اُس کے پاس آکر اپنے گھریلو مسائل بیان کرتے۔ وہ ہمیشہ اہل بیتؑ کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے مسائل کو حل کرتا۔ اُس کے نرم الفاظ لوگوں کے لیے مرہم ہوتے۔

شہید بھائی کی برداشت کی مثال نہیں ملتی۔ اگر کوئی اُسے گالی بھی دیتا تو وہ صبر کرتا۔ جواباً گالی نہ دیتا، بلکہ نرمی سے سمجھاتا۔ اور پھر وہی لوگ اُس کے اخلاق سے اتنے متاثر ہوتے کہ دوبارہ کبھی بُرا لفظ نہیں کہتے۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب مقبل کا ایک گاؤں آگ میں جل رہا تھا تو لوگ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف تھے۔ لیکن میرا بھائی زخمیوں اور شہیدوں کو

نکالنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کی زندگیاں بچاتا۔ یہی اُس کی اصل پہچان تھی۔

وہ بوشہرہ، مقبل، بلیشخیل اور بگن کے محاذوں پر بہادری سے لڑا۔ جنگ کی سختیوں میں جہاں دوسرے اپنی جان بچانے کے لیے مورچوں میں چھپ جاتے، میرا بھائی آگے بڑھ کر زخمیوں کو کندھوں پر اٹھاتا۔ اُن شہیدوں اور زخمیوں کی دعاؤں نے اُسے شہادت کے بلند مقام تک پہنچا دیا۔

اور پھر وہ دن آیا... جمعرات کا دن۔

میں نے اُس سے کہا تھا: "بھائی! آپ گھر کب آؤ گے؟"

اُس نے کہا: "فکر نہ کرو، جمعرات کو ضرور آؤں گا۔"

واقعی وہ آیا، لیکن کفن میں لپٹا۔ رات کے نو بجے اُس کا جنازہ ہمارے گھر پہنچا۔ میں بڑے بھائی علی اصغر کے ساتھ بازار میں تھا جب خبر ملی کہ کمانڈر اور کئی جوان شہید ہو گئے ہیں۔ پہلے یقین نہیں آیا۔ دل کہتا تھا یہ جھوٹ ہے۔ وہ زندہ ہے، وہ ضرور آئے گا۔

لیکن جب اعلان ہوا تو حقیقت سامنے آئی۔ اُس لمحے لگا جیسے زمین پیروں تلے سے کھسک گئی ہو۔ میرا بھائی اپنے وعدے پر قائم رہا۔ جمعرات کو لوٹ آیا، مگر شہادت کے تاج کے ساتھ۔

شہید کی بھائی کی زبانی

راوی: علی اکبر آزانچی

میرا بھائی اللہ کا عاشق بندہ تھا۔ وہ ہمیشہ اللہ پر توکل کرتا اور ہر مشکل میں صبر کا دامن تھام لیتا۔ اکثر کہا کرتا تھا:

"مشکل کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے، اس پر بھروسہ رکھو۔"

مجھے یاد ہے، ایک وقت ایسا آیا کہ میں شدید مسائل میں گھرا ہوا تھا۔ راستے بند نظر آرہے تھے۔ انہی دنوں میرا شہید بھائی میرے ساتھ کھڑا رہا۔ جب وہ یہ الفاظ دہراتا تو میرے دل کو سکون مل جاتا:

"اللہ پر توکل کرو، اسی سے مدد مانگو، یقیناً اس مشکل میں اللہ کا کوئی راز چھپا ہے۔"

وہ کنجوس ہرگز نہ تھا۔ اللہ کے راستے میں کھلے دل سے خرچ کرتا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرتا تھا جو اپنے لیے پسند کرتا۔ یہی اس کی زندگی کی روشنی تھی۔

شہید بھائی بے حد صابر انسان تھا۔ میں کبھی کبھار اسے کسی بات پر ڈانٹ دیتا، لیکن اس نے کبھی جواب میں مجھے کچھ نہ کہا۔ حالانکہ چاہتا تو وہ بھی مجھے ڈانٹ سکتا تھا، مگر اس نے ہمیشہ بڑوں کا ادب اور خاموشی کو ترجیح دی۔ اگر کوئی اسے گالی دیتا تو وہ صبر کرتا، اور

جواب میں گالی دینے کے بجائے محبت سے سمجھاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہی شخص پھر کبھی زبان درازی نہ کرتا بلکہ شہید بھائی کی باتوں سے متاثر ہو جاتا۔

شہید بھائی کی زندگی کا مقصد دنیاوی فائدہ نہیں تھا۔ اس کا ہدف کچھ اور بلند تھا، اسی لیے وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاموش رہتا تاکہ کوئی رکاوٹ اس کے اصل مقصد کے راستے میں نہ آئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جس رات مقبل کا ایک گاؤں جل گیا تھا، میں بھی محاذ پر موجود تھا۔ بہت سے لوگ مالِ غنیمت لوٹنے میں لگے تھے۔ لیکن میرا بھائی اسحاق حسین زخمیوں کو اٹھانے اور شہیدوں کی لاشیں نکالنے میں مصروف تھا۔ اس وقت میرے دل نے کہا:

”جہاں کچھ لوگ دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، وہاں میرا بھائی آخرت کا زادِ راہ کما رہا ہے۔“

یہی نہیں، بلکہ بوشہرہ، مقبل، بلیشخیل اور بگن کے محاذ پر بھی وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر زخمیوں کو اٹھاتا اور شہیدوں کو نکالتا رہا۔ جب سب اپنی جان بچانے کے لیے مورچوں میں چھپ جاتے، وہ سب سے آگے بڑھ کر دوسروں کی مدد کرتا۔ یہی وہ دعائیں تھیں جو آج اسے شہادت کے اعلیٰ مقام تک لے گئیں۔

ہمارا شہید بھائی حساس دل رکھنے والا انسان تھا۔ دوسروں کا درد اپنا درد سمجھتا، ان کے مسائل کو حل کرتا، اور ان کے زخموں پر مرہم رکھتا۔ اکثر اس کی دکان پر لوگ آتے اور گھریلو مسائل بیان کرتے۔ وہ ہمیشہ اللہ اور اہل بیت علیہم السلام کے وسیلے سے ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا۔

جب بگن کے مقام پر قافلے پر حملہ ہوا اور لوگ بے دردی سے شہید کیے گئے تو وہ جمعرات کا دن تھا۔ میرا بھائی بھی اسی جمعرات کو گھر سے نکلا تھا اور بلیشخیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں وہ بہادری سے لڑ رہا تھا۔

ایک دن میں نے اسے فون کیا اور کہا:

"بھائی، کئی دن ہو گئے ہیں، اب آپ کو گھر آ جانا چاہیے۔"

اس نے جواب دیا، اور یہ جملہ ہمیشہ میری یادوں میں زندہ رہے گا:

"آپ سب گھر والے فکر نہ کریں، میں جمعرات کے دن ضرور آؤں گا۔"

ہاں، اس نے سچ کہا تھا۔ وہ جمعرات کو ہی آیا، مگر عجیب انداز میں...

جمعرات کی رات نو بجے اس کا جنازہ ہمارے گھر پہنچا۔ وہ صبح آٹھ بجے محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ جنگ کی شدت کے باعث اس کا جنازہ وہیں رکا رہا، اور پھر شام کو ہمارے گھر لایا گیا۔

شہادت کی خبر

میں اپنے بڑے بھائی علی اصغر کے ساتھ بازار میں تھا کہ رشتہ دار نے گھر بلایا۔ جب ہم پہنچے تو اعلان کے ذریعے خبر ملی کہ ہمارا چھوٹا بھائی شہید ہو گیا ہے۔

اس لمحے میرا حال ایسا تھا کہ مجھے خود بھی خبر نہ رہی میں کہاں جا رہا ہوں۔ دیوانہ وار ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ دل کہہ رہا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ آخر اس نے کہا تھا:

"میں جمعرات کو آؤں گا۔"

اور وہ سچ میں آیا...

مگر زندہ لاش کی صورت میں نہیں، بلکہ شہید کے جنازے کی صورت میں۔

یہ وہ کرب ہے جو ایک بھائی کی زبانی سن کر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

شہید کی زندگی صبر، ایثار، توکل اور شجاعت کا مجموعہ تھی۔ اور اس کی شہادت زندہ مثال ہے کہ "شہید مرتے نہیں، بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

شہید کی دوست کی زبانی

تحریر: اقائِ حامد حسین مجلسی

میں اُس بہادر فرزندِ پاراچنار کے بارے میں چند سطریں عرض کرنا چاہتا ہوں جن کا نام کمانڈر شہید اسحاق حسین تھا۔ میں اپنی استطاعت کے مطابق اُن کی زندگی، کردار اور فرائض کی ادائیگی کا کچھ ذکر کر رہا ہوں، مگر سچ تو یہ ہے کہ میں اس عظیم انسان کے ایک قدم کا بھی صحیح معنوں میں بیان نہیں کر سکتا—میرے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔

بہادری کی کئی اقسام ہوتی ہیں، مگر اسحاق حسین کی بہادری ایک الگ نوعیت کی تھی۔ بہادر اکثر زندہ نہیں رہتے؛ کیونکہ وہ اپنی بہادری کے سبب شہادت پاتے ہیں۔ بہادر سینہ تان کر دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہوتے ہیں، ہر گولی کا مقابلہ کرتے ہیں اور تادمِ آخر ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ لڑتے، قربانی دیتے، تکلیف برداشت کرتے اور سرزمین سے عشق کرتے ہیں — یہ تمام خصوصیات شہید اسحاق میں بلا تفریق موجود تھیں۔ وہ ایک مخلص ساتھی، بے خوف وطن پرست اور انقلاب سے وابستہ شخصیت تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے انقلابی علماء و مجاہدین جانتے تھے کہ اگر ظالموں کو آج چھوڑ دیا گیا تو آنے والی نسلیں برباد ہوں گی۔ اس لئے انہوں نے رشتے ناطے اور دنیا کے تمام آسودگیوں کو پس پشت ڈال کر میدانِ کارزار کا انتخاب کیا۔

شہید اسحاق حسین نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ یہ باور کراتے تھے کہ ہم نے اپنا سر نہیں جھکایا، موت کو گلے لگالیا۔ ہم نے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھا، اور اگر موت آئی تو اسے بھی ہم نے شیر ایمان کی طرح قبول کیا۔ موت اُن کے نزدیک زندگی کا اختتام نہ تھی بلکہ عاشقِ وطن کے لیے لامحدود زندگی کا آغاز تھا۔ جو لوگ اپنی زندگی کو کسی عظیم مقصد کے لیے قربان کر دیتے ہیں، وہ حیاتِ جاوداں پالیتے ہیں اور یہی مقام شہادت کا ہے۔

دینِ اسلام میں وطن اور ناموس کی خاطر جان دینے والوں کو شہید کہا جاتا ہے؛ وہ اپنی جان لوٹاتے ہوئے حقیقت میں یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ زندگی ربّ تعالیٰ کی امانت تھی اور وہ اسی امانت کو لوٹا گئے۔ شہید کمانڈر اسحاق حسین اپنے والدین، بہن بھائیوں، اہلیہ اور بچوں، اور دوست احباب کے لیے فخر کا موجب تھے۔ ان کے لیے وہ امید اور عزم کا مرکز تھے۔

میں ذاتی طور پر شہید اسحاق حسین کی کئی صفات بیان کرنا چاہوں تو الفاظ کم پڑ جائیں گے، مگر چند باتیں ضرور لکھوں گا:

وہ انتہائی اخلاقی، مخلص اور پاکباز انسان تھے۔ جب وہ زیارتِ اربعین کے لیے جاتے تو دل سے دعا کرتے، اور ہر زیارت کے بعد دو رکعت نمازِ زیارت اور دو رکعت

نمازِ حاجت پڑھتے — وہ مجھ سے بھی التماس کرتے کہ ان کے لیے دعا کروں کہ انہیں شہادت ملے۔ ان کی یہ آرزو اصل میں ان کے ایمان کی گہرائی کا آئینہ تھی۔

جب وہ محاذِ جنگ میں ہوتے تو دشمن کے سامنے ڈٹ کر لڑتے۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے چھوٹے بچوں کا بدلہ لیا، گاؤں کو دشمن کی صفوں سے آزاد کروایا— مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ تیسری روز جب میں اُن سے رابطہ کرنا چاہا تو فون بند تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں اور اُن کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ اے شہید! تمھاری قربانی کے آگے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔

حُسنِ اخلاق اُن کی شخصیت کا خاص جزو تھا۔ تم جیسا دوست دوبارہ ملنا مشکل ہے۔ وہ نہ صرف بہترین جنگجو تھے بلکہ مخلص اور بہترین انسان بھی تھے — ایک ایسے دوست جن کی مخلصی اور وفا فراموش نہیں کی جا سکتی۔

شہید اسحاق حسین کی بہادری، قربانی اور حب الوطنی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ہم اُن کی یاد کو زندہ رکھیں گے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گا۔ وہ واقعی اپنے مقام پر فائز ہیں۔

اللہ تعالیٰ شہید کمانڈر اسحاق حسین پر رحمت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

شہید کے دوست کی زبانی

راوی: عابد حسین

میں نے شہید کمانڈر اسحاق حسین کو پہلی بار اسکول کے زمانے میں دیکھا۔ اُس وقت ہماری ملاقات زیادہ نہ ہو سکی کیونکہ ہم عُمر میں ان سے کچھ بڑے تھے، لیکن وہیں سے ایک محبت بھرا رشتہ قائم ہوا۔ بعد میں شہید کچھ عرصہ دبئ گئے، اور ملاقات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب دلاسو کی جنگ شروع ہوئی، تو وہیں میری دوبارہ ملاقات شہید کمانڈر سے ہوئی، اور وہ ملاقات اب ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی۔

شہید کمانڈر کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ بہادر تھے، وفادار تھے، نرم دل اور صاف نیت والے انسان تھے۔ اُن کی باتوں میں سچائی، اُن کے دل میں خلوص، اور اُن کی طبیعت میں محبت بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف میرے نہیں، بلکہ ہر اُس شخص کے دل میں جگہ بنا گئے جس نے انہیں دیکھا یا جانا۔ وہ جگہ ایسی ہے جو قیامت تک قائم رہے گی۔

اگر میں اُن کی سب سے نمایاں خصوصیت بیان کروں تو کہوں گا کہ وہ ایک مومن پرہیز گار، امامِ زمانہ علیہ السلام کے سچے سپاہی، محبِ وطن اور نڈر مجاہد تھے۔ ان کی خاموشی، ان کی وفاداری، اور ان کی شجاعت نے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنایا۔

جب دلاسو کی جنگ کے بعد ہم نے اُنہیں اپنے گروپ میں شامل کیا، تو وہ بہادری اور ایمانداری کے ساتھ سب سے نمایاں نظر آئے۔ اُن کی قائدانہ صلاحیتیں دیکھ کر ہم نے انہیں گروپ کا کمانڈر بنایا۔ وہ صرف محاذ پر بہادری دکھانے والے نہیں تھے بلکہ ساتھیوں کی حفاظت، زخمیوں کی خدمت اور ہر مشکل گھڑی میں سب سے آگے بڑھ کر ذمہ داری لینے والے حقیقی لیڈر رتھے۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ شہید کمانڈر ہمیشہ محاذ کی سب سے آگے والی لائن پر لڑتے تھے۔ وہ سب سے سخت ترین مورچہ چنتے اور کبھی ڈر یا خوف اُن کے چہرے پر نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر بار محاذ پر جانے سے پہلے وضو کرتے اور اپنے رب کے حضور جھکتے۔یہی ان کا اصل ہتھیار تھا۔یمان اور یقین۔

دوستی میں بھی وہ ایسے تھے جیسے گھر کا بڑا سہارا ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ ہمیشہ شفقت، خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آتے۔وہ مذاق بھی کرتے، باتیں بھی کرتے مگر ذمہ داری ہمیشہ اپنے کندھوں پر اُٹھاتے۔ آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا کمر ٹوٹ گیا ہو۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ میرا دایاں ہاتھ تھے، اور آج میرا وجود اُن کے بغیر ادھورا ہے۔

محاذ پر اُن کی ایک یاد آج بھی میرے دل کو ہلا دیتی ہے۔ بوشہرہ کی جنگ میں خرلاچی کا ایک ساتھی شدید زخمی ہو گیا۔ وہ نہایت وزنی بھی تھا۔ اُس وقت حالات اتنے

سخت تھے کہ کوئی قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا، لیکن کمانڈر اسحاق حسین نے اکیلے اُس زخمی کو اُٹھایا اور محفوظ جگہ تک پہنچایا۔ وہ نہ صرف جنگ لڑتے تھے بلکہ زخمیوں کے مرہم بھی بنتے تھے۔

شہید کمانڈر کے دل میں صرف ایک آرزو تھی — شہادت کی آرزو۔ مگر یہ آرزو صرف خواہش نہیں تھی، اس کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی محنت، عبادت اور قربانی میں گزار دی۔ جیسے شہید محسن حججی نے کہا تھا:

"ایسی زندگی گزارو کہ خدا تمہارا عاشق ہو جائے، اور جب خدا عاشق بن جائے تو بہترین خریدار بن جاتا ہے۔ اور جب خدا خرید لیتا ہے، تو شہادت کے ذریعے اپنے پاس بلا لیتا ہے۔"

یہی کمال شہید اسحاق حسین کا تھا۔ وہ غریبوں کے مددگار بھی تھے، یتیموں کے سرپرست بھی، دوستوں کے محافظ بھی اور راہِ حق کے سپاہی بھی۔ جب کبھی راستے میں کوئی غریب ملتا تو وہ ضرور اُس کی مدد کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ رزق ہم پر اللہ کی امانت ہے، اور اس کا حق دار کبھی خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔

آج شہید کمانڈر ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، مگر ان کی یادیں ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ وہ ہم سے بچھڑ گئے لیکن حقیقت میں وہ امر ہو گئے۔ وہ چراغ تھے جو

ظلمتوں میں جلے، وہ مٹی کے بیٹے تھے جنہوں نے اپنی مٹی کو خون سے سیر اب کیا، اور وہ سپاہی تھے جنہوں نے اپنی زندگی دے کر ہمیں زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔

باب دوئم:

شہادت کے بعد کے واقعات

شہید کے جنازے پر آئے ہوئے لوگ آج بھی وہ منظر یاد کرتے ہیں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ سب کہتے تھے کہ اسحاق حسین پہلے ہی نورانی تھے، مگر جب وہ شہید ہوئے تو ان کے چہرے کا نور اور بڑھ گیا تھا — داڑھی چمک رہی تھی اور ہونٹوں پر ایک مدہوش سی مسکراہٹ تھی۔ ہمیں محسوس بھی نہ ہوا کہ وہ شہید ہوئے ہیں؛ لگ رہا تھا جیسے وہ بس سوئے ہوئے ہوں گے اور جلدی جاگ جائیں گے۔

کزن کا بیان بھی دل چیر دینے والا ہے۔ جب شہید کا جنازہ ہمارے بیٹھک میں رکھا گیا تو میں نے ان کے قریب جا کر ان کی داڑھی تھامی اور پوچھ بیٹھا: "تمہارے بچے کیا بنیں گے؟ وہ بہت چھوٹے ہیں۔" تب شہید نے مسکرایا — مسکراہٹ ایسی کہ میری پوری ہڈیاں ڈانواڈول ہو گئیں۔ میں گھبرا گیا اور اپنے بھانجے سے کہا تو اس نے بتایا کہ وہ نہ صرف مجھے مسکرائے بلکہ ہم سب کو مسکرائے تھے جب میں نے ان سے بات کی تھی۔ یہ مسکراہٹ آج بھی میرے دل کو چیر دیتی ہے۔

شفاء اور توسل کے واقعات

شہید سے حاصل ہونے والی شفاعتوں اور معجزات کی کہانیاں بھی کم نہیں۔ ان میں سے کچھ سچے اور عجیب واقعات یہ ہیں:

• ایک کزن بتاتے ہیں کہ اُن کے گھٹنے اور پیروں میں بہت درد تھا۔ علاج کے باوجود فرق نہ پڑا۔ چنانچہ انہوں نے مضبوط ارادہ کیا کہ وہ شہید کے قبر پر جائیں گے۔ پہلے چلنا ممکن نہ ہوا، مگر جب انہوں نے شہید سے دعا مانگی — "اے شہید اسحاق حسین! میرے پیروں کو اتنی طاقت دے کہ میں آپ کے قبر تک جا سکوں" — تو اللہ نے کرم کیا اور ان کے قدم ٹھیک ہو گئے۔ وہ قبر پر پہنچے اور پھر سے مکمل صحت پا گئے۔ اللہ نے اس شہید کے وسیلے سے طبیعت ٹھیک فرمائی۔

• خادمہ آمین بتول کا واقعہ بھی سن کر دل غم سے بھر آتا ہے: جب بھی وہ شہید کے قبر پر جاتی تھیں تو وہاں عورتیں، بوڑھے اور بچے آکر بتاتے کہ اُن کا بیمار بچہ ٹھیک ہو گیا، یا سفر کا مسئلہ حل ہو گیا۔ ایک عورت نے کہا کہ اُس کا بیٹا سفر میں پریشان رہتا تھا، مگر جب اس نے شہید سے مدد مانگی تو بیٹا سلامت لوٹ آیا۔

یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ شہید بابِ اللہ ہوتا ہے — زندہ ہوتا ہے، سنتا اور دیکھتا ہے، اور اللہ جب چاہے اپنے خاص بندوں کے وسیلے سے شفا و مدد عطا کرتا ہے۔

ایک خواب والدہ کی تسلی

ایک خاتون نے بتایا کہ انہوں نے خواب میں ایک نورانی جوان دیکھا، جس کی داڑھی چمک رہی تھی۔ وہ جوان بولے: ”تم اپنے بیٹے شہید جاوید حسین سے کیوں ناراض ہو؟ وہ جب سے یہاں آیا کے ہمارے پاس اداس رہتے ہیں۔“ پھر اُس نے بتایا کہ وہ دراصل محمد افضل کے بیٹے ہیں، جو اُن کے جنازے میں آئے تھے۔ یہ خواب دیکھ کر اُس ماں کا دل اپنے بیٹے کے بارے میں مطمئن ہو گیا۔ یہ بھی ایک ایسی تسلی تھی جو آنکھوں سے نظر نہ آتی مگر دل میں سکون بھر دیتی ہے۔

یہ واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ شہید کی حقیقت صرف ایک انسانی موت کا قصہ نہیں۔ یہ وہ زندہ حقیقت ہے جو دلوں کو سہارا دیتی ہے، مصیبتوں میں امید جگاتی ہے، اور لوگوں کے دکھوں کو کم کرتی ہے۔ جنازے کے وہ مناظر، مسکراہٹیں، اور قبر پر آنے والوں کی سسکیاں — یہ سب اس امر کی دلیل ہیں کہ شہید مٹی میں سوتے نہیں، وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں۔

کربلا کی فضا آج یہاں جھلکتی ہے: جیسے وہاں زینبؑ نے اپنے شہیدوں کو سینے سے لگایا اور صبر کی مثال دی تھی، ویسے ہی ہمارے محلے میں بھی وہ مائیں، بہنیں اور رشتے دار باطل کی دشمنی کے سامنے سر نہ جھکانے کی مثال بن گئے۔ شہید کے چہرے کی

مسکراہٹ، اُس کی بخشش، اور اس کے وسیلے سے ہونے والی شفاعتیں — یہ سب ہمیں کربلا کی صدا یاد دلاتی ہیں: ظلم کے خلاف کھڑا ہونا اور حق پر استقامت۔

اختتامی پیغام

ہر معاشرے کے نوجوان بہت سی مشکلات میں گھِرے رہتے ہیں۔ کبھی وہ بے راہ روی، نشے اور وقت ضائع کرنے جیسی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، کبھی دل میں یہ شکوہ رکھتے ہیں کہ زندگی میں راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اکثر مایوسی انہیں جکڑ لیتی ہے، اور وہ سوچتے ہیں کہ شاید ان کا وجود بے معنی ہے۔

لیکن اگر ہم شہید اسحاق حسین جیسے عظیم انسانوں کی زندگی کو دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ مشکلات راستے کا پتھر نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا زینہ ہیں۔ شہید نے اپنی زندگی میں صبر اور اللہ پر توکل کو شعار بنایا۔ جہاں دنیا کے لوگ مالِ غنیمت لوٹنے میں لگے ہوئے تھے، وہاں وہ زخمیوں کو سہارا دینے اور شہیدوں کو اٹھانے میں مصروف تھا۔ یہی اصل کامیابی ہے، کہ دوسروں کے لیے جیا جائے۔

نوجوانو!

شہید اسحاق حسین کی حیات ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مشکل کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، امید کا دامن نہیں چھوڑنا۔ ہر وقت اللہ پر بھروسہ رکھنا، اور اپنے مقصد کو بلند رکھنا۔

اگر وہ نوجوان اپنے آپ کو غفلتوں اور وقتی خواہشات سے بچالے تو یقیناً وہ نہ صرف اپنی ذات کو سنوار سکتا ہے بلکہ اپنے پورے معاشرے کو روشنی دے سکتا ہے۔

شہید کی زندگی ہمارے سامنے ایک عملی مثال ہے کہ جوانی صرف کھیل کود یا دنیاوی فائدوں کے لیے نہیں، بلکہ انسانیت کے درد کو سمجھنے، دوسروں کے کام آنے اور اللہ کے راستے پر چلنے کے لیے ہے۔ وہی جوان کامیاب ہے جو اپنے کردار سے اپنے معاشرے کے دلوں پر نقش چھوڑ جائے۔

الوداعی کلمات

اے شہید اسحاق حسین!

تیری زندگی نے ہمیں سکھایا کہ صبر، ایثار اور قربانی ہی اصل زندگی ہے۔ تیری شہادت نے ثابت کیا کہ موت انتہا نہیں، بلکہ ایک نئ زندگی کی ابتدا ہے۔ تیرے لہو نے ہمارے دلوں کو بیدار کیا اور ہمیں یہ راستہ دکھایا کہ عزت کی زندگی صرف قربانی مانگتی ہے۔

ہم تجھے الوداع کہتے ہیں مگر یہ الوداع جدائی کی نہیں، بلکہ وعدے کی ہے۔

وعدہ کہ ہم تیرے مشن کو جاری رکھیں گے،

وعدہ کہ ہم تیرے لہو کے قرض کو کبھی فراموش نہ کریں گے،

وعدہ کہ ہم تیرے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی جوانی کو انسانیت اور ایمان کے لیے وقف کریں گے۔

اے شہید!

تیری مسکراہٹ تیرے جنازے پر بھی باقی رہی، تیرے لبوں کی روشنی آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تو زندہ ہے، اور ہمیں دیکھ رہا ہے۔ تیرے خون کی سرخی نے ہمارے خوابوں کو بیدار کر دیا ہے۔

سلام ہو تجھ پر، اے شہید کمانڈر!

سلام ہو تیری زندگی پر، سلام ہو تیری شہادت پر۔

اور یہی سلام اس کتاب کا اختتام ہے، مگر تیری یادوں کا نہیں...

آیت العظمیٰ سید علی خامنہ ای

شہدا، جانباز اور ایثار پیشہ افراد حق
کے محاذ کا ہراول دستہ ہیں
جنہوں نے اس سرزمین کے
رہنے والوں کو شہادت پر عقیدہ
رکھنا اور اللہ تعالیٰ سے تجارت
کرنا سکھایا ہے۔

حدیثِ پرواز

ترجمہ: سید اسحاق حسین